Date of Publication: 09-01-204
PRICE Rs. 2/-
POSTED ON 10-11 Jan. 2014
R.N.I No. 2186/57
POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)
ہفت روزہ
ہماری زبان
انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

15-21 January 2014 | ۱۵تا۲۱/جنوری ۲۰۱۴ء
Issue: 3, Vol.: 73 | شمارہ نمبر:۳، جلد نمبر:۷۳

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا
اجلاسِ اوّل
منعقدہ علی گڑھ ۱۸۸۶ء

صدر مولوی حاجی محمد سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم
سی ایم جی، رئیس دہلی

مولوی انوار احمد زبیری مارہروی

پہلی قسط

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے ہندستانی مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے باب میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ 1875 میں سرسید نے علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد رکھا اس کے دس سال بعد 1886 میں سرسید نے محسوس کیا کہ ہندستان جیسے وسیع و عریض ملک میں کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کوئی ایسی جماعت نہ ہو جو ملک کے مختلف صوبوں کا دورہ کرکے مسلسل اس کی تبلیغ و اشاعت نہ کرے۔ چناں چہ وہ انجمن قائم ہوئی جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے جانی گئی۔ اس کانفرنس کے چالیس خطبات صدارت کو مولوی انوار احمد زبیری مارہروی نے 1927 میں 'خطبات عالیہ' کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ وہ خطبات صدارت ہیں جو تعلیم کے موضوع پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی چالیس کانفرنسوں میں ہندستان کی مشہور و معروف علمی و ادبی شخصیتوں نے پیش کیے۔ ان خطبات میں مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال، جدید تعلیم کے فوائد اور اس کے حصول کی بحثوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پہلی کانفرنس کی صدارت مولوی محمد سمیع اللہ خاں نے کی تھی جو سرسید کے رفقا میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ یہاں 'ہماری زبان' کے قارئین کے لیے مولوی محمد سمیع اللہ خاں کا مختصر خطبۂ صدارت مع اس تحریر کے نقل کیا جارہا ہے جو مولوی انوار احمد زبیری مارہروی نے اپنی کتاب میں ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھی ہے تاکہ نئی نسل ان کے کارناموں سے آگاہ ہو سکے اور یہ جان سکے کہ جن اداروں نے ہندستانی مسلمانوں کی علمی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے ان کی تشکیل میں کون سا جذبہ کارفرما تھا اور اس کے لیے ہمارے بزرگوں کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ قارئین کی سہولت کے لیے اسے جدید املا کے مطابق نقل کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

حالات صدر

ممدوح (مولوی محمد سمیع اللہ خاں) 1834 میں اپنے وطن (دہلی) میں پیدا ہوئے۔ نسباً "علوی" تھے جن کا سلسلہ چونتیسویں پشت میں حضرت علیؓ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ہندستان میں مسلمانوں کا دور اقبال تنزل و انحطاط کے آخری درجے تک پہنچ رہا ہے۔ مسلمانوں کی فرماں روائی اور سلطنت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ جہانگیر کی جہانگیری اور عالمگیر کی عالمگیری سمٹ کر لال حویلی کی محدود چہار دیواری میں محصور ہے اور شمع اقبال شمع سحری بن کر بجھنے کے قریب ہے۔ سوسائٹی سے اچھی سیرت اور بزرگوں کے اخلاق اور ان کے علم و فضل کی جگہ جہالت، تعصبات، توہمات، مراسم پرستی لیتی جاتی ہے۔ دولت و حشمت کی بربادی کے ساتھ شرافت نفس کے جذبات عالیہ ایک ایک کرکے قوم سے رخصت کے طالب ہیں۔

انھوں نے جب دار الخلافہ 'دہلی' میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا تو بزم نشاط و اقبال کی جگہ صف ماتم بچھی دیکھی۔ رہروان صراط مستقیم کے نقش پا کی جگہ یہی یادگاروں کو اپنے سامنے اُجڑتے اور مٹتے ہوئے دیکھا۔ اس بدبختی اور بدنصیبی کے دور میں بقیۃ السیف چند ہستیاں ایسی باقی تھیں جو تشنہ کامان علم و ہدایت کی رہنمائی اور تہذیب نفوس کی کارفرما تھیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں شروع زمانہ بچپن ہی میں غیر معمولی طور پر ذہین معلوم ہوتے تھے اور آثار رشد و ہدایت ان کی پیشانی سے ہویدا تھے۔ جس گھر میں ان کی پیدائش ہوئی تھی وہ خود تہذیب و شائستگی اور امارت کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ شفیق باپ نے شروع سے اکتساب علم و فضل کی طرف توجہ کی۔ بیٹے کی فطری ذہانت اور سعادت نے صلاحیت نفس کی بشارت دے کر ہمت کا قدم آگے بڑھایا۔ رسم بسم اللہ خوانی کے بعد حرف شناسی سے آگے بڑھے تو مولوی محمد حسین نے فارسی کی تعلیم دی۔ میر پنجہ کش نے خوش نویسی میں پختگی کی۔ مولوی مملوک علی، مولوی سید محمد جیسے جید علما اور مفتی صدر الدین خاں جیسے علامۂ یگانہ کی توجہ سے اٹھارہ برس کی عمر میں معقول، منقول، فقہ، اصول فقہ، حدیث وغیرہ کی تکمیل کرکے طلبہ کی صف سے نکل کر خود مسند علم کے جانشین اور وارث قرار پائے۔ ان کی علمی شہرت نے دور دور کے طلبہ کو ان کے حلقۂ درس اور آغوش تعلیم و تربیت میں جا بٹھایا۔ مولوی صاحب بڑے ذوق و شوق سے پڑھاتے تھے بالخصوص ان کے طرز تعلیم کی ان دنوں (دلّی) میں خاص شہرت تھی۔ لڑکپن ہی سے ان کو میلوں ٹھیلوں، مجمعوں اور سیر تماشوں سے نفرت تھی۔ چناں چہ غیر مشروع امور سے وہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک متنفر رہے۔ وہ ہمیشہ اعلا و ادنا سے بہ اخلاق پیش آتے تھے۔ ان کی زبان سے کریہہ اور ثقیل الفاظ بھی ان کے نوکروں تک نے نہیں سنے۔ وہ اعتدال کو ہر کام اور ہر حالت میں ملحوظ رکھتے تھے۔ روپیہ پیسہ خرچ کرنے میں مفید اور غیر مفید باتوں کا لحاظ پیش نظر رہتا تھا۔ اسراف سے نہایت احتیاط تھی لیکن قومی اغراض میں بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو سیکڑوں اور ہزاروں روپیہ چندہ میں انھوں نے دیا۔

تحصیل علم کا شوق ہر زمانے میں رہا اور کتاب کے مطالعے نے آخر وقت تک حق رفاقت ادا کیا۔ سنجیدگی، متانت اور وقار کی وہ تصویر تھے۔ ہنسی، چہل کی باتیں کرنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ احکام مذہب کی عظمت اور بزرگی ان کی زندگی کا نصب العین رہی۔ نماز کے وہ ایسے پابند تھے کہ جب سے وہ فرض ہوئی مدت العمر کبھی قضا نہ کی۔ یہی حال روزوں کا تھا کہ کیسا ہی گرم موسم ہو وہ روزے برابر رکھا کرتے تھے۔ جنوری 1901 میں انھوں نے حجاز کا سفر کیا۔ مکہ مکرمہ میں حج اور زیارت سے فارغ ہوکر مدینہ طیبہ میں روضۂ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوئے اور فیوض و برکات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ڈھائی مہینے مکہ مکرمہ میں اور چھ مہینے مدینہ طیبہ میں قیام کیا۔ دوران قیام مکہ مکرمہ میں مولانا حافظ محمد عبدالحق صاحب مکی سے جو عالم باعمل بزرگ تھے، سند 'دلائل الخیرات' حاصل کی اور بعد از مراجعت سفر حجاز اس کو صحت کے ساتھ چھپوا کر شائع کیا۔

علوم دینی اور مذہبی کے درجۂ فضیلت کو طے کرنے کے بعد ۱۸۵۲ء میں انھوں نے قانونی تعلیم کی طرف توجہ کی اور امتحان وکالت اور منصفی میں کامیاب ہوئے۔ جب ان امتحانوں میں یہ کامیاب ہوئے اور کامیابی کی خبر ان کے استاد علامۂ زماں مفتی صدر الدین خاں نے سنی تو خوش ہوکر ان کو مبارک باد دی اور آبدیدہ ہوکر کہا 'افسوس اب تم مشاغل قانونی میں مصروف رہ کر علوم قدیمہ کی شمع کو روشن نہ رکھ سکو گے۔'

تمھارے استادوں کا نام زندہ رہ سکے گا جنھوں نے اس غرض سے جہاں تک ان سے ممکن تھا تمھیں علم و ادب سے آراستہ کیا تھا''۔

ہولناک زمانۂ غدر کو انھوں نے اپنی ہوش مندی کے عالم میں دیکھا۔ عام ہمدردی اور حسنِ سلوک ان کا فطری جوہر تھا۔ دلی میں جو تباہی مسلمان امرا اور شرفا پر آئی وہ ان سب کے شریکِ حال تھے۔ ہمدردی اور نیکی کا ہاتھ بڑھانے میں جو کار نمایاں انھوں نے اس پُر آشوب وقت میں انجام دیے، یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ خدا ترسی کے امتحان میں وہ پورے اُترے۔ بیسیوں شرفا کے جرمانے انھوں نے اپنے پاس سے ادا کیے اور بیسیوں قیدیوں کو جیل خانے کی کوٹھریوں سے نکالا۔ خود ان کے استاد مفتی صدرالدین خاں بہ سلسلۂ بغاوت نظر بند ہوئے۔ مولوی صاحب نے ان کی رہائی کے لیے جان لڑا دی، انجام کار مفتی صاحب تمام شبہ شبہات سے بری ہوئے اور جو جائداد ان کی ضبط ہو گئی تھی وہ بھی واپس دی گئی۔ ایک نواب زادے کو پھانسی ہوئی ان کی رہائی کے لیے سرسید ان دنوں میرٹھ میں بیٹھے ہوئے اور سمیع اللہ خاں دلی میں رہ کر ان کی جان بچانے کی کوششیں کر رہے تھے۔

دلی میں ہنگامۂ دار و گیر گرم ہے۔ جہاں جس کا منہ سر سماتا ہے بھاگنا چاہتا ہے۔ سمیع اللہ خاں بھی تنگ دل ہیں اور بال بچوں کو لے کر باہر جانے کی فکر میں ہیں۔ سواری عنقا ہے۔ بہ ہزار خرابی رتھیں حاصل کیں۔ ایک میں اپنے بیوی بچوں کو بٹھایا دوسری رتھ لے کر سرسید کے گھر پہنچے۔ اس میں ان کی بیوی اور بچوں کو جن میں سید محمود اور سید حامد بھی تھے سوار کرایا اور سب کو ساتھ لے کر اور خود پاپیادہ سفر کر کے نظام الدین اولیا پہنچے۔

سرسید کی والدہ اور ان کی خالہ باوجود اصرار کے گھر چھوڑنے پر راضی نہ ہوئیں۔ ان کے جانے کے بعد سرسید کے ماموں وحید الدین خاں اور ان کے ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں دونوں نشانۂ بندوق بنے۔ بہ وجہ قابلیت ذاتی اور شرافت خاندانی 1858 میں ان کو عہدۂ منصفی دیا گیا اور کان پور میں تعیناتی ہوئی۔ چار سال تک منصفی کرنے کے بعد ان کو وکالت کرنے کا خیال آیا۔ اس شوق نے ترکِ ملازمت پر آمادہ کیا اور 1862 سے 1874 تک تقریباً گیارہ سال تک نہایت شہرت کمال نیک نامی کے ساتھ آگرہ اور الہ آباد کی صدر دیوانی اور صدر نظامت و ہائی کورٹ میں فرائض وکالت انجام دیے۔

دلی میں جس طرح ان کا گھر مدرسۂ دینیات تھا اور دور دور کے طالب علم ان سے پڑھنے آتے تھے اسی طرح دورِ وکالت میں اس زمانے کے نوجوانوں کو پیشۂ قانون کی طرف مائل کر کے درسِ قانونی دیا کرتے تھے۔ چناں چہ میرٹھ کے مشہور وکیل سید محمد حسین، سہارن پور کے مشہور مقنن مولوی ناظر حسن اور علی گڑھ کے نامور وکیل خواجہ محمد یوسف، مولوی سمیع اللہ خاں کی قانونی تعلیم کے ثمرِ اوّل تھے۔ 1872 میں جب سید محمود انگلستان سے بیرسٹر بن کر لوٹے اس وقت مولوی سمیع اللہ خاں الہ آباد میں تھے۔ سید محمود کو آپ نے عملی حیثیت سے اس پیشے کے رموز و اشارات سے واقف کیا اور جب خود سب جج کے عہدے پر پہنچے تو اپنے تمام مقدمات ان کو دے دیے۔

1873 میں مولوی صاحب کے یورپین دوستوں خصوصاً آنریبل جسٹس لی پیرن نے ان کو سرکاری ملازمت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ ہندستانیوں میں جتنے وکلا تھے آپ پہلے ممبر تھے جو پہلی بار صدر الصدور بنائے گئے۔ چناں چہ عہدۂ صدر الصدوری کا جائزہ سب سے پہلے آپ نے علی گڑھ میں لیا۔

ان کے کامیاب پیشۂ وکالت کی تعریف میں اور مسلمہ قانونی قابلیت کی مدح میں اور ان کے ممتاز سوانحِ زندگی کے حالات میں ۱۸/ستمبر 1907 کو اخبار 'پانیر' نے خاص طور پر ایک آرٹیکل نکالا جس میں ان کی قادرالکلامی، قانونی موشگافیوں کی داد دی گئی تھی۔ نیز ہائی کورٹ کے ججوں نے ان کے تقرر صدر الصدوری کے عہدے کے موقعے پر ان کی قانونی قابلیت کا منظرِ عام پر اعتراف کر کے اظہارِ مسرت کیا تھا۔

زمانۂ وکالت کا بہت سے موکلوں پر محنتانہ باقی رہ گیا، جس کی تعداد تقریباً ساٹھ ہزار روپیہ ہوتی تھی، جب وہ علی گڑھ میں صدر الصدور ہو کر آ گئے تو ان میں کے اکثر موکل محنتانہ لے کر آئے۔ لیکن انھوں نے اس خیال سے کہ جب وکالت ترک کردی ہے تو محنتانہ واپس لینے کا خیال بھی چھوڑ دیا اور آئی ہوئی رقوم واپس کردیں۔ وہ نہایت نامی گرامی صدر الصدور کی حیثیت سے علی گڑھ، الہ آباد، مراد آباد اور فتح گڑھ میں کارفرما رہے۔ جس وقت وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کو تبدیل ہوتے تھے تو گروہ خواص سے لے کر عام پبلک تک میں اُداسی چھا جاتی تھی۔

علی گڑھ سے مراد آباد کو 1881 میں آپ کا تبادلہ ہوا۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ یکم اکتوبر 1881 میں آپ کے الوداعی جلسے کی کیفیت نہایت غمگین اور افسردہ الفاظ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔

مولوی صاحب نے بیرونِ ہندستان کے تین سفر کیے۔ 1880 میں انگلستان اور دوسرا 1884 میں مصر کا، تیسرا سفر حجاز تھا۔ جس مقصد سے سرسید انگلستان گئے تھے یہی مقصد ان کا بھی تھا۔ چناں چہ اپنے سفرنامۂ انگلستان کے ایک ٹکڑے میں وہ اپنے اغراضِ سفر کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''میرے دل میں ایک مدت سے دو سفروں کا شوق تھا۔ ایک تو عرب کے سفر کا اور دوسرے یورپ کے سفر کا۔ عرب کے سفر کو زیادہ تر تعلق مذہبی حالت سے ہے اور یورپ کے سفر کو انسان کی بھلائی، ملکی و قومی ہمدردی، اخلاق و معاشرتی و دماغی خیالات کی ترقی سے۔ میں نے عرب کا سفر ہنوز نہیں کیا ہے۔

دوسرا سفر مصر کا ملکی سیاست کے تقاضے سے تھا۔ 1884 میں ارل نارتھ بروک سابق وائسرائے ہند جب مصر کے لارڈ ہائی کمشنر کر کے مصر میں مامور کیے گئے تو انھوں نے گورنمنٹ ہند سے ایک لائق اور قابل شخص کے مانگے جانے کی خواہش کی اور اس ذریعے سے اس اہم خدمت پر مولوی صاحب منتخب کیے گئے۔ انھوں نے یورپ اور مصر دونوں سفروں کے نہایت دل چسپ سفرنامے لکھے ہیں جن کے پڑھنے سے ان ملکوں کے اس زمانے کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ یورپ کی ہر چیز کا خصوصاً تعلیم گاہوں کا غور سے مطالعہ کرتے تھے اور انھوں نے یورپ کے اسبابِ ترقی کو گہری نظر سے دیکھا تھا۔ جب وہ یورپ سے واپس ہوئے تو سرسید نے بمبئی جا کر ان کا استقبال کیا اور انھیں جہاز سے اتارا۔

جب مولوی صاحب مصر کے کارِ خاص سے سبک دوش ہو کر ہندستان واپس آئے تو سر الفرڈ لائل لفٹنٹ گورنر کے عہد میں سب جج کے عہدے سے آپ ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کے ممتاز عہدے پر فائز کیے گئے اور تقریباً آٹھ سال تک ایک فاضل اور نامور جج کی حیثیت سے آپ نے اس اہم ذمہ داری کی خدمات نیک نامی کے ساتھ انجام دیں۔ آپ کی صحت نہایت عمدہ حالت میں تھی۔ چاہتے تو عرصے تک اس عہدے پر رہ سکتے تھے لیکن اس خیال سے کہ دنیا گزشتنی و گزاشتنی ہے۔ فیصلہ کیا کہ آخر زمانہ حیات یادِ خدا میں بسر ہو۔ چناں چہ 1892 میں اپنی خواہش سے وظیفہ لے کر سرکاری خدمت سے علاحدگی اختیار کرلی۔

ان کے ترکِ ملازمت کو حاکمانِ اعلا نے نقصانِ عظیم محسوس کیا اور گورنر سے لے کر ہائی کورٹ اور ملکی اخبارات تک نے ان کی سروس سے علاحدگی پر اظہارِ افسوس کیا۔ ان کو تصنیف و تالیف سے بھی ذوق تھا۔ کتبِ درسیہ کی اوق کتابوں پر عربی زبان میں حسبِ ضرورت حواشی تحریر کر کے ان کو چھپایا۔ اسی طرح فلسفے کی کتابوں پر حواشی لکھے۔ حال کی قانونی کتابوں کا خلاصہ قلم بند کیا۔ اگر ان کی تمام تصنیفات شائع ہو جاتیں تو بلاشبہ وہ ایک مفید ذخیرۂ علمی اپنی یادگار چھوڑتے مگر افسوس کہ یہ تمام ذخیرہ دہلی کی مصیبت میں تلف اور برباد ہو گیا۔

ملکی اور شاہی تقریبات میں ہمیشہ ان کی ممتاز جگہ ہوتی تھی۔ 1885 میں بہ مقام لکھنؤ نواب لفٹنٹ گورنر نے ایک خاص جلسے میں ان کے سینے پر سی ایم جی کا تمغہ آویزاں کیا اور اس معزز خطابِ شاہی کی سند دی جو ملکِ معظم کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ اس خوشی میں اُمرا اور اکابر لکھنؤ نے اسی دن قیصر باغ کی بارہ دری میں مولوی صاحب کو ڈنر دیا۔ اس جلسے کے صدر شاہزادہ مرزا سلیمان قدر بہادر سابق شاہ اودھ کے بھائی تھے۔

وظیفہ یاب ہونے کے بعد سالار جنگ اول سالار جنگ ثانی نواب وقار الامرا اور سر آسمان جاہ بہادر غرض چاروں مدار المہام سرکار آصفیہ نے وقتاً فوقتاً ایما فرمایا کہ مولوی صاحب حیدرآباد میں سرکار آصفیہ کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو جائیں۔ ڈھائی ہزار تنخواہ کے علاوہ یہ ترغیب بھی دی گئی تھی کہ مولوی صاحب کے پسرِ اکبر کو تاحیات تین سو روپیہ ماہوار کا منصب بھی سرکار نظام سے عطا ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کے اخراجاتِ تعلیم متعلق انگلستان کا بار بھی خزانۂ عامرہ پر رہے گا جس کی مجموعی رقم تین ہزار ہوتی تھی۔ یہ بھی وعدہ تھا کہ واپسی پر اور انتظامِ تعلیم انگلستان کے بعد وہ بھی خدمتِ شائستہ پر فائز کیے جائیں گے۔ لیکن ان کی قناعت اور گوشہ گیر طبیعت پر کسی ترغیب اور تحریص کا رنگ نہ چڑھنا تھا نہ چڑھا اور شکر و شکریہ کے ساتھ اس وابستگی سے دامن بچاتے رہے۔

ان کی زندگی کا بڑا مقصد اور شروع خیال قومی تعلیم تھا۔ درس و تدریس سے فارغ ہونے کے بعد ان کی تجویز تھی کہ مسلمانوں میں عربی تعلیم کی رغبت اور خواہش پیدا کی جائے، چناں چہ 1862 میں انھوں نے دہلی میں عربی کا مدرسہ کھولا۔ کلکتہ مدرسے میں مولوی سید بدرالدین جو رئیس المدرسین تھے، پنشن لے کر دہلی چلے آئے تھے، سو روپیہ ماہوار پر وہ اس عہدے کے مدرسِ اول مقرر ہوئے۔ مدرسے کا خرچ دو سو روپیہ ماہوار تھا لیکن چندے کی مقدار ہمیشہ کم رہی جس کو مولوی صاحب اپنی ذات سے پورا کرتے تھے۔ کافی عرصے تک یہ مدرسہ زندہ رہا اور اچھی لیاقت کے عربی داں اشخاص مدرسے نے پیدا کیے، لیکن جب وکالت کی غرض سے مولوی صاحب نے دلی چھوڑی تو یہ مدرسہ بھی 1869 میں بند ہو گیا۔

مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنا اور اس کا وجود سرسید کے بعد اگر کسی دوسری کوشش اور توجہ کا رہینِ منت ہے تو مولوی سمیع اللہ خاں کا۔ جب سرسید کے دل میں مسلمانوں کی تعلیم کا اور اس کے ذریعے سے ان کی اصلاح اور ترقی کا خیال پیدا ہوا تو اس تصویرِ خیالی کے پیکر میں مولوی سمیع اللہ خاں نے روح پھونکی۔

(باقی آئندہ)

ooo

مصحفی

امروهه، آنوله، دلّی اور لکھنؤ میں

ڈاکٹر الف ناظم (امن گیٹ، ابوبکر نگر، دیوریا 274001، یوپی)

دوسری قسط

امروہہ دہلی سے مشرق کی جانب واقع ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے امروہے کا سفر کیا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں امروہے کو ایک 'چھوٹا سا خوب صورت شہر' لکھا ہے۔ امروہہ حضرت مسیح کی ولادت سے کئی صدی پہلے سے آباد بتایا جاتا ہے جہاں قدیم زمانے سے ہی علما، صوفی اور شعرا آ کر بسنے لگے تھے۔ نورالحسن نقوی نے امروہے کی وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"ہستناپور کے راجاؤں کی اولاد میں ایک راجا 'امر جودھا' گزرا ہے اس نے ۲۷۴ء قبل مسیح میں اسے اپنے نام سے آباد کیا تھا۔ لیکن آگے چل کر اسے 'امروہہ' کہا جانے لگا۔"

امروہے سے مصحفی کی وابستگی کے بارے میں ان کے اشعار میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ صرف ایک شعر میں امروہے کا ذکر ہے۔ البتہ تذکروں میں انھوں نے امروہے کے مشاعروں اور وہاں کی شعری نشستوں کا ذکر کیا ہے بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ فلاں فلاں شاعر کو انھوں نے امروہے میں دیکھا اور فلاں سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں، فلاں کی صحبت سے فیض یاب ہوئے، مثلاً بیزادہ مجروح کے بیان میں لکھا ہے:

"جن دنوں مکتب میں تھا، مجروح کی امروہہ ضلع میں شاعر کی حیثیت سے شہرت تھی۔"

(فارسی سے ترجمہ)

مصحفی نے اپنے تذکرے میں امروہے کو ضلع لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس وقت اس کی حیثیت ضلعے کی ہو لیکن امروہہ حال ہی میں ضلع بنایا گیا ہے، اس سے قبل یہ قصبے کے طور پر جانا جا رہا ہے۔ افسوس کہ اب اس ضلع کا نام حکومت اتر پردیش نے 'مہاتما جیوتبا پھولے نگر' کر دیا ہے۔

محتشم خاں محتشم کو بھی مصحفی نے عمر کے ابتدائی زمانے میں دیکھا تھا۔ مصحفی کے بیان کے مطابق وہ ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ ریختہ اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ محتشم خاں شاہ جہاں آباد (دلی) کے رہنے والے تھے۔ مصحفی لکھتے ہیں:

"محتشم خاں محتشم قوم کمبوہ ساکن شاہ جہاں آباد شخص مسن و معمر معاش فارسی ہر دو می گفت۔"

اسی طرح وہ شاہ عبدالرسول نثار اکبرآبادی سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں۔ نثار میر تقی میر کے شاگرد اور قادری سلسلے کے بزرگ تھے۔ نثار سے مصحفی کی بیشتر مشاعرے میں ملاقات رہتی تھی۔ گفتگو کا موضوع شعر و شاعری ہوا کرتا تھا۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

"فقیر او را در ابتدائے شاعری در قصبہ امروہہ دیدہ بود۔ اکثر بعد چند در مشاعرہ ملاقات می شد و تذکرہ شعر بمیاں می آمد۔"

مصحفی کے ان بیانات سے ظاہر ہے کہ ان کا بچپن امروہے ہی میں گزرا اور ان کی شاعری کی ابتدا بھی یہیں ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں امروہے میں شعرا کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ عربی و فارسی تعلیم کا رواج عام تھا۔ مشاعرے اور شعری نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں مقامی شعرا کے علاوہ بیرونی شعرا بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ مصحفی کی ذہنی نشوونما اسی ماحول میں ہوئی۔ خود مصحفی کے مطابق عنفوان شباب ہی سے وہ علم حاصل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ بزرگوں کی صحبت میں نظم و نثر پر دسترس حاصل کی اور آخر کار زمانے کے رواج کو دیکھتے ہوئے ریختہ گوئی کو اپنا شعار بنا لیا۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

"ایں فقیر چوں بجنت و طالع آنچہ نداشت ہچار از آغاز شباب بہ تحصیل علم بود چنانچہ بہ فیض صحبت بزرگاں اول از تحصیل نظم و نثر زبان فارسی و تحقیق محاورہ و اصلاح آں فراغت حاصل کردہ بہ مقتضائے رواج زمان آخر کار خود را مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ۔"

ایک فارسی شعر میں مصحفی اپنی شاعری کے نشوونما کو دہلی کا فیضان بتاتے ہیں:

نشوونمائے شعر من از دہلی است اے مصحفی
آباد دار وحق جل ایں خاک آدم پرور را

جائے پیدائش اور تاریخ ولادت ہی کی طرح مصحفی کے استاد کا معاملہ بھی خاصا الجھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی تذکرہ نگاروں کے متضاد بیانات ملتے ہیں۔ مصحفی نے اپنے استاد کا ذکر تو کیا (اشعار میں) لیکن ان کے نام کی وضاحت نہیں کی۔ البتہ ایک شعر میں کسی 'بانی' کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی کسی نثری تحریر سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ امروہے میں خلیفہ بیگا (شیخ عبداللہ) کا ذکر تصوف کے دلدادہ کے طور پر کیا گیا ہے، یہ امروہے کے مشہور بزرگ تھے، کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ مصحفی نے کسی خلیفہ چندا کا ذکر بھی اپنے تذکروں میں کیا ہے۔ اس بنیاد پر افسر صدیقی نے یہ قیاس کیا کہ ممکن ہے کہ یہی 'خلیفہ بیگا' ہوں گے اور انھی سے مصحفی نے ابتدائی تعلیم پائی۔ افسر نے یہ بھی لکھا ہے کہ خود انھوں نے امروہے کے کسی بزرگ سے شیخ عبداللہ کا نام سنا تھا جو بانی تخلص رکھتے تھے۔ یعنی مصحفی کے استاد یہی 'بانی' ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں افسر نے مصحفی کے جس فارسی شعر کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

گر کسے مرتبہ شاعری نہ فہمیدے
مصحفی ہر بکف خود قلم بانی داشت

محسن نے 'سراپا سخن' میں، ناصر نے 'خوش معرکہ زیبا' میں اور اصغر حسین نے 'تاریخ اصغری' میں مصحفی کو 'بانی' کا شاگرد لکھا ہے جب کہ مولانا محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں مصحفی کے استاد کا نام 'امانی' لکھا ہے۔ امروہے کی تاریخ میں خلیفہ بیگا عرف شیخ عبداللہ کا ذکر ملتا ہے، اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہی مصحفی کے استاد رہے ہوں۔ دیوان محتشم میں ایک شعر میں اپنے استاد کا اس طرح ذکر کیا ہے:

اے مصحفی استاد وہی ہووے گا آخر
جو میری طرح خدمت استاد کرے گا

نورالحسن نقوی نے افسر صدیقی اور بعض دوسرے محققین کے بیانات کی تردید کی اور خیال ظاہر کیا کہ مصحفی نے اپنے کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی یعنی بہت سے بلند مرتبہ شاعروں کی طرح وہ تمیذ رحمٰن تھے اور بس۔ ہمارا خیال ہے کہ مصحفی نے جس جگہ اپنے استاد کا ذکر کیا ہے اس سے مراد وہ معلم ہے جس سے انھوں نے مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس معلم کا نام 'بانی' ہو اور یہ وہی بزرگ ہوں جن کا نام امروہے کے قدیم دستاویزات میں مل جاتا ہے۔ مصحفی کے کوئی استاد رہے ہوں یا نہیں لیکن خود مصحفی ایک مسلم الثبوت استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔

مصحفی نے ۷۷-۱۷۷۰ء میں امروہے کو خیر باد کہا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۳-۲۲ برس رہی ہوگی۔ اس کے ایک سال بعد ہی مشہور شاعر اور بزرگ مظہر جانجاناں امروہے میں تشریف لائے تھے۔ ترک وطن کا سبب، مصحفی کے ایک شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی بات پر روٹھ کر وہاں سے چلے آئے تھے:

اے مصحفی تو واں سے کیوں روٹھ کے اٹھ آیا
رہ جائے تری خاطر کرتا ہے وطن سارا

ترک وطن کی ایک اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مصحفی تلاش معاش کی غرض سے گھر سے نکلے تھے۔ اس وقت دہلی کے حالات بہتر نہ تھے۔ ممکن ہے وہ اہل خاندان سے دل برداشتہ ہو کر یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوئے ہوں۔ غرض کوئی وجہ تو ضرور رہی ہوگی کہ پھر کبھی وطن کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ اگرچہ وطن کی یاد انھیں اکثر آتی رہی:

اس ساعت بد چھٹے وطن سے کہ پلٹ کر
سو ہم نے نہ دیکھا کبھی پھر سوئے وطن کو

اے مصحفی نہ دیکھا ہوئے وطن پھر آ کر
شاید کہ چھٹیے تو اے یار گھر سے نکلا

قسمت مری بری تھی کیا پوچھتے ہو یارو
میں کیا کہوں کہ کیسے گھر بار گھر سے نکلا

امروہے سے نکل کر مصحفی پہلے آنولہ اور پھر ٹانڈہ پہنچے۔ یہ روہیل کھنڈ علاقے میں واقع ہیں۔ اس وقت شاہ عالم دہلی کے سلطان تھے۔ شمالی ہندوستان چار حصوں میں تقسیم تھا، روہیل کھنڈ، اودھ، بہار اور بنگال۔ مولوی عبدالحق نے تذکرہ ہندی کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مصحفی دلّی سے آنولہ اور ٹانڈہ سے پہنچے۔ امیر احمد علوی نے بھی لکھا ہے کہ مصحفی کا عہد طفلی امروہہ میں گزرا، ابتدائی تعلیم یہیں ہوئی۔ شعر گوئی کی بسم اللہ بھی ہوگئی۔ اس کے بعد بارہ برس کی عمر میں مصحفی تحصیل علم کے لیے دلّی آئے۔

(باقی آئندہ)

اردو دُنیا

اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے بی ایس اے کو میمورنڈم

سہارنپور (۲۶ دسمبر)۔ معلم اردو اور اردو ٹیچر ٹریننگ کے بعد ذات کی کونسلنگ کے باوجود تقرری کا پروانہ نہ ملنے پر آج اردو اساتذہ نے بی ایس اے کو میمورنڈم دیا۔ میمورنڈم میں کونسلنگ کے بعد تقرری نہ ہونے پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے اور کہا گیا کہ نومبر میں ضلع سہارنپور میں 71 اردو اساتذہ کی کونسلنگ مکمل ہو چکی ہے اور دیگر اضلاع میں اساتذہ کی تقرریاں بھی ہو چکی ہیں لیکن سہارنپور میں ابھی تک کسی ایک کی بھی تقرری نہیں ہوئی ہے۔ اساتذہ کے اس وفد کی قیادت کرنے والے نوشاد احمد نے کہا کہ بی ایس اے یہ عذر پیش کر رہے ہیں کہ حکومت کی طرف سے ان کو اس سلسلے میں کوئی ہدایت یا حکم نہیں آیا ہے۔ حکم نامے کے بعد ہی تقرری کا پروانہ دیا جائے گا۔ بی ایس اے کو میمورنڈم دینے والوں میں احتشام، دلشاد اور انیس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ (راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو میڈیم لکچررس کے تقررات کی منظوری

نارائن کھیڑ، آندھرا پردیش (۹ دسمبر)۔ جناب میر احمد علی، جناب میر احمد علی، جناب عتیق الرحمن، جناب محمد آصف، جناب محمد توصیف اور مسلم نوجوانان نارائن کھیڑ، محمد ارشد، محمد اسحاق خاں، عبداللہ عثمان اور محمد جابر نے اپنے مشترکہ بیان میں گورنمنٹ جونیئر کالج نارائن کھیڑ میں انٹرمیڈیٹ HEC اردو میڈیم کو پڑھانے کے لیے پانچ مستقل لکچررس کے تقررات کی منظوری کے لیے رکن اسمبلی نارائن کھیڑ جناب پی کشٹا ریڈی کی ریاستی حکومت سے کامیاب نمائندگی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے خواہش کی کہ ان لکچررس کی جلد از جلد تقرری عمل میں لائی جائے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

عدالت عالیہ کے فیصلے پر عمل آوری کا مطالبہ

گورکھپور (۲۳ دسمبر)۔ علاقائی سکریٹری معلم اردو ایسوسی ایشن حکیم محمد ندیم عالم وارثی نے پریس کو جاری ایک بیان میں کہا ہے کہ جامعہ اردو کے امتحانات ادیب سے شروع ہو کر معلم اردو پر ختم ہوتے ہیں۔ معلم اردو اللہ آباد ایسوسی ایشن کے صدر محمد نسیم اور دیگر لوگوں کی عرضی پر سماعت کے بعد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ نے جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحان ادیب اور مدرسہ بورڈ کے امتحان منشی کو ہائی اسکول کے مساوی تسلیم کرتے ہوئے تقرری کے عمل میں شامل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ندیم عالم وارثی نے بتایا کہ مذکورہ امتحان کے امیدواروں کو تقرری عمل میں شامل کرنے کے لیے حکومت کو حکم صادر کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے ذمہ داروں کی نیت صاف نہیں تھی جس کی بنا پر ان لوگوں کی درخواست فارموں کو ہی تبدیل کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ موجودہ حکومت جلد از جلد تقرری کے لیے سرکاری حکم نامہ جاری کرے اور عدالت عالیہ کے فیصلے کو تسلیم کرے۔

(آگ۔ لکھنؤ)

ضلع ایجوکیشن آفیسر عادل آباد کا دو اردو میڈیم اسکولوں کا اچانک معائنہ

عادل آباد، آندھرا پردیش (۲۳ دسمبر) ضلع ایجوکیشن آفیسر عادل آباد جناب اکرام اللہ خاں نے مستقر عادل آباد کے دو اردو میڈیم اسکولوں کا اچانک معائنہ کرتے ہوئے دسویں جماعت میں زیر تعلیم اردو میڈیم کی لڑکیوں کے کلاس میں جا کر ریاضی، انگریزی اور تلگو لکھنے اور پڑھنے کے لیے کہا۔ اس پر دسویں جماعت کی لڑکیوں نے لکھنے میں کئی غلطیاں کیں اور پڑھنے میں بھی کئی غلطیاں پائی گئیں۔ اس پر ضلع ایجوکیشن افسر جناب اکرام اللہ خان نے صدر مدرس محترمہ کوثر اور متعلقہ مضامین کے استادوں کو بلوا کر غصے کا اظہار کیا اور صدر مدرس محترمہ کوثر سے کہا کہ آپ کے اسکول اور خاص کر دسویں جماعت کے طلبہ کی تعلیمی حالت مایوس کن ہے اور یہ دسویں جماعت اس وقت تک کامیاب نہیں کر سکتے جب تک کہ آپ اپنے ماتحت اساتذہ کو اپنی خاص نگرانی میں دسویں جماعت کے طلبہ کے لیے خصوصی تعلیم کا انتظام نہ کریں ورنہ یہ لڑکیاں دسویں میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ ضلع کلکٹر عادل آباد نے بار بار ڈی ای او اور ضلع کے عہدیداران کو تاکید کر رہے ہیں کہ دسویں جماعت کے سالانہ امتحانات میں جو کہ مارچ میں منعقد ہونے جا رہے ہیں، نقل نویسی نہیں ہوگی اور پولیس کی بھاری نگرانی میں امتحانات منعقد ہوں گے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

15 اضلاع میں اردو کے نفاذ اور اسٹاف کی قلت کا جائزہ

حیدرآباد (۲۱ دسمبر)۔ آندھرا پردیش اقلیتی کمیشن نے اردو کے فروغ اور اردو دوسری سرکاری زبان والے پندرہ اضلاع میں سرکاری دفتروں میں اردو کے نفاذ اور اساتذہ، اسٹاف اور عہدیداروں کی قلت کا جائزہ لینے کے لیے 12 ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جو اضلاع کا دورہ کر کے کمیشن کو رپورٹ دے گی۔ اس کمیٹی میں پروفیسر فاطمہ پروین، محمد اسماعیل الرب انصاری، سید طارق قادری ایڈوکیٹ، محمد مسعود الدین احمد لیکچرر، پروفیسر ایم رحیم خواب، نصیر الدین سید شوکت علی، سید ہدایت اللہ، ڈاکٹر کے اقبال، فضل الرحمن، محمد سمیع الدین اور عنایت علی شامل ہیں۔ یہ اعلان آج جناب عابد رسول خاں (چیئرمین اقلیتی کمیشن) نے میڈیا سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ یہ دورے جنوری تا جون ۲۰۱۴ء ہوں گے۔ اس دوران تمام اضلاع کا احاطہ کیا جائے گا ہر ایک ضلع کا دورہ کیا جائے جہاں ضرورت کے مطابق کمیشن دو یا تین تک قیام بھی کرے گا۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

اردو کے ساتھ یہ کیسا انصاف؟

جنرل کلرک کو 5 سال میں جب کہ اردو مترجمین کو 15 سال میں پروموشن

اعظم گڑھ (۲۴ دسمبر)۔ اردو کی ترقی اور فروغ کے سلسلے میں سپا حکومت نے بہت کچھ وعدے کیے تھے لیکن موجودہ حکم نامے سے صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ اردو کی ترقی تو کیا اس کی دشمنی پر آمادہ ہے۔ یہ باتیں اردو مترجم ایسوسی ایشن اترپردیش ضلع اعظم گڑھ اکائی کے صدر رضوان احمد نے کہیں۔ وہ آج مقامی کنور سنگھ پارک میں ایسوسی ایشن کی جانب سے منعقد ماہانہ میٹنگ کو خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ جنرل کلرک پروموشن پانچ برس کی نوکری مکمل کرنے کے بعد کا حکم نامہ جاری کیا گیا ہے جب کہ حکومت نے اردو مترجمین کا پروموشن پندرہ برس تک ملازمت کرنے کے بعد کا حکم نامہ جاری کیا ہے جو اردو مترجمین کے ساتھ ناانصافی ہے۔ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری شباب احمد خاں نے کہا کہ کسی بھی لحاظ سے یہ فیصلہ منصفانہ نہیں ہے کہ اردو مترجم کا پروموشن پندرہ برس کی ملازمت کرنے پر منحصر کیا جائے۔ یہ سراسر اردو مترجمین کے ساتھ زیادتی ہے۔ عمران احمد نے کہا کہ اردو مترجم حکومت و انتظامیہ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ نائب صدر محمد شاہد اعظمی نے کہا کہ سپا حکومت اگر اپنے رویے پر نظرثانی نہیں کرے گی تو اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے اس کو تیار رہنا چاہیے۔ نائب سکریٹری امتیاز احمد نے کہا کہ اردو صرف اترپردیش ہی نہیں بلکہ پورے ملک کی ایک بڑی زبان ہے اس کو ہر طرح سے پھلنے پھولنے کا پورا حق ہے۔ شکیل احمد نے کہا کہ سماج وادی پارٹی کے قومی صدر ملائم سنگھ یادو نے جب پہلی بار اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی بات کی تھی اور یوپی میں اردو مترجم کی تقرری کی تو ایسا لگ رہا تھا کہ اردو کے ساتھ ہونے والے مظالم کا خاتمہ قریب ہے مگر انھی کی پارٹی کی حکومت اگر اردو کے ساتھ ناانصافی کر رہی ہے تو یہ بہت افسوسناک بات ہے۔ سید قمر مہدی نے کہا کہ آزادی کے بعد سے لے کر آج تک کانگریس اور دوسری حکومتوں نے اردو کے ساتھ جو سوتیلا رویہ اختیار کیا اب اس کو انصاف دینے کا وقت آ گیا ہے اور یہ کام صرف سماج وادی پارٹی ہی کر سکتی ہے۔ کلام احمد نے کہا کہ آزادی کے بعد سے آج تک اردو صرف زبانی وعدے کو ہی ترس رہی ہے کسی بھی حکومت نے جائز طریقے سے اپنے وعدے کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ صدارت رضوان احمد اور نظامت شباب احمد خاں نے کی۔ اس موقعے پر خورشید احمد، محمد حیدر، محمد مطیع اللہ، حاجی محمد سعد اللہ ظفر الضیاء، وفادار حسین، اخلاق احمد، فیضان احمد، شمیم احمد، انیس احمد اور راشد وغیرہ سمیت کثیر تعداد میں اردو مترجم موجود تھے۔

(اردو ایکشن۔ بھوپال)

ناندیڑ اردو پرائمری اسکول کی منتقلی کو روکنے کے مطالبے پر عدم توجہی

ناندیڑ، مہاراشٹر (۲۵ دسمبر)۔ اقلیتی طلبہ کے لیے حاضری بھتہ، یونیفارم کی تقسیم اور ضلع پریشد اردو پرائمری اسکول تقسیم پورہ ناندیڑ کی منتقلی کو روکنے کے مطالبات پر توجہ نہ دینے والے ایجوکیشن آفیسر کے خلاف کارروائی کرنے کا مطالبہ رکن ضلع اقلیتی فلاح و بہبود نگراں کار کمیٹی محمد زبیر احمد نے ضلع کلکٹر سے تحریری طور پر کیا۔ تفصیلات کے مطابق محمد زبیر احمد نے اپنے میمورنڈم میں کہا کہ اقلیتی طلبہ کی تعلیمی ترقی کے پیش نظر انھیں حکومت کی جانب سے حاضری بھتہ اور مفت یونیفارم تقسیم کرنا طے پایا تھا لیکن ناندیڑ ضلع کے اقلیتی مدارس میں ایسا کوئی کام نہیں کیا گیا۔ تعلیمی سال اپنے اختتام پر ہے اور اقلیتی طلبہ کو حکومت کی جانب سے مہیا کرائے جا رہے تعلیمی وسائل سے محروم رکھا گیا ہے۔ میمورنڈم میں کہا گیا کہ ایجوکیشن چیئرمین ضلع پریشد اور ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر کے تیقن کے بعد ۲۶ جولائی ۲۰۱۳ء کو منعقد کیے جانے والے احتجاج کو منسوخ کیا گیا لیکن پھر بھی ہمارے مطالبات پر کسی قسم کی کوئی عمل آوری نہیں کی گئی۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

کالج میں اردو اخبار بھی منگایا جائے

آسنسول (۲۲ دسمبر)۔ آج گلی کالج میں گورننگ باڈی کی میٹنگ کے دوران اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری سیف خاں کی طرف سے گلی کالج کے نکلنے والے میگزین میں اردو زبان کو جگہ دینے کی ایک تجویز پیش کی گئی ہے۔ سیف خاں نے ایک اور اہم تجویز یہ پیش کی کہ کالج میں جہاں تمام زبانوں کے اخبارات آ رہے ہیں وہیں اردو کا بھی ایک اخبار منگایا جائے تاکہ اردو زبان کے طلبہ و طالبات اس اردو اخبار سے مستفید ہو سکیں۔ اس گورننگ باڈی کی میٹنگ میں ریاستی وزیر مولائے گھٹک نے بھی شرکت کی تھی۔

(آبشار۔ کلکتہ)

آکاش وانی گورکھپور میں سال بھر سے نہیں ہوا اردو پروگرام

محبان اردو میں غم و غصہ

گورکھپور، یوپی (۱۸ دسمبر) آل انڈیا ریڈیو گورکھپور سے گزشتہ ایک برس سے ایک بھی اردو پروگرام ریکارڈ نہ ہونے سے محبان اردو اور شعراء و ادبا کے اندر غم و غصے کا ماحول قائم ہے۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ دیگر شعبوں کی ریکارڈنگ آکاش وانی میں کرائی جا رہی ہے، اگر سوتیلا سلوک کیا جا رہا ہے تو صرف اردو کے ساتھ۔ آکاش وانی پر تعینات ذمہ داروں سے پوچھا جا رہا ہے تو ان کا کہنا ہے کہ بجٹ نہ رہنے کے سبب نئی ریکارڈنگ نہیں ہو پا رہی ہے۔ آکاش وانی اردو شعبہ گورکھپور میں اپنی غزلیں، تقاریر اور نعت و منقبت وغیرہ پیش کرنے والے ساحل گورکھپوری، اختر بستوی، احتشام اختر گورکھپوری، مولانا مبارک حسین مصباحی، قاری اشعر عزیزی اور اخلاق وغیرہ کا کہنا ہے کہ گزشتہ ایک برس سے ہمارا کوئی پروگرام ریڈیو اسٹیشن گورکھپور سے نشر نہیں ہوا۔ مہراج گنج، گورکھپور، کشی نگر، مئو، سنت کبیر نگر، بستی، اسد عارف نگر وغیرہ اضلاع سے تعلق رکھنے والے باذوق اردو سامعین نے بھی الزام عائد کیا ہے کہ ریڈیو اسٹیشن گورکھپور سے اردو کا نیا پروگرام سال بھر سے نشر نہیں ہوا۔ پرانے پروگرام جو برسوں قبل نشر کیے جا چکے ہیں وہی بار بار دہرایا جاتا ہے، ایسا لگتا ہے اردو کو ریڈیو سے مٹانے کی سازش تو نہیں ہو رہی ہے۔ اردو انچارج عزالہ شہناز کا تبادلہ ہوئے کئی مہینے گزر گئے مگر ان کی جگہ کسی کی تعیناتی نہیں کی گئی اور نظامت کے لیے پرائیویٹ طور پر رکھے گئے اسٹاف بھی حکومت اور ذمہ داران کے اردو کے تئیں متعصبانہ رویہ سے عاجز آکر کسی اور ڈپارٹمنٹ سے منسلک ہونے کا اب منصوبہ بنا رہے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ مہنگائی کے اس پرآشوب دور میں جب سال سال بھر پروگرام نشر نہیں ہوگا تو اس میں بنے رہنے سے کیا فائدہ؟ ظاہر سی بات ہے کہ اسٹاف جب پروگرام پیش کرے گا تو اسے معاوضہ دیا جائے گا جب پروگرام نشر نہیں ہوگا تو نذرانہ نہیں ملے گا اور گورکھپور ریڈیو اسٹیشن میں گزشتہ سال بھر سے مذکورہ عمل جاری ہے۔ کتنے لوگ عاجز آکر اب آکاش وانی کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ کچھ نوجوان ریڈیو اسٹیشن گورکھپور میں اردو شعبے سے منسلک ہوکر پرائیویٹ طریقے سے گزشتہ پندرہ برسوں سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھیں ابتدائی دور سے ہی یہ امید تھی کہ تجربے کی بنیاد پر حکومت و انتظامیہ کے لوگ انھیں کنفرم ایمپلائی منتخب کریں گے مگر افسوس ان نوجوانوں کو کنفرم کرنا تو دور ریڈیو اسٹیشن میں انھیں پرائیویٹ طور پر رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں آکاش وانی گورکھپور کے ہیڈ ڈاکٹر اروند ترپاٹھی کے موبائل نمبر 9415313214 پر نمائندہ نے جب بات کی تو ان کا جواب تھا "نو بجٹ نو پروگرام"۔ مسٹر ترپاٹھی یہ کہہ رہے تھے کہ بجٹ نہ ہونے سے کسی بھی شعبے کا پروگرام نہیں ریکارڈ کرا رہے ہیں بجٹ جب ہوگا تو نئے پروگرام کی ریکارڈنگ کرائی جائے گی۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ صرف گورکھپور ہی نہیں دیگر ریڈیو اسٹیشن (اترپردیش) کا بھی حال ہے۔ اب اس میں کہاں تک سچائی ہے یہ تو حکومت و اعلا افسران ہی بتا سکتے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ محبان اردو میں کافی رنج و غم کا ماحول قائم ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو زبان کو حق دلانے کی مہم جاری رہے گی

نئی دہلی (۲۵ دسمبر)۔ فیڈریشن فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ کی ایک میٹنگ فیڈریشن کے صدر دفتر سی بلاک دلشاد کالونی میں منعقد کی گئی جس کی صدارت فیڈریشن کے چیئرمین عبدالعلیم برنی نے کی۔ میٹنگ میں ممبران و عہدیداران نے دہلی میں اردو کی ترقی اور فروغ کے علاوہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور بنیادی مسائل پر بھی تفصیلی غور و خوض کیا۔ اس کے علاوہ مختلف ایجنڈوں پر بھی فیڈریشن کے کام پر عہدیداران نے روشنی ڈالی اور گزشتہ دو برسوں میں فیڈریشن کے ذریعے کیے گئے کاموں کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کی۔ فیڈریشن کے چیئرمین عبدالعلیم برنی نے کہا کہ فیڈریشن دہلی میں اردو زبان کو اس کا جائز حق دلانے والی بیداری مہم کو بدستور جاری رکھے گی۔ اس کے علاوہ میٹنگ میں مولانا منہاج احمد قاسمی، ڈاکٹر محمد شعیب، ڈاکٹر ایمن میاں، محمد اسلم اور جاوید الحق نے بھی دہلی میں اردو زبان کی مہم کو فعال بنانے پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ میٹنگ کی نظامت فیڈریشن کے جنرل سکریٹری مسٹر شکیل احمد صدیقی نے کی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کے انتقال پر

غالب انسٹی ٹیوٹ میں تعزیتی میٹنگ

نئی دہلی (پریس ریلیز)۔ معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کے انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ میں ۲۳ دسمبر ۲۰۱۳ کو ایک تعزیتی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، شاہد ماہلی اور رضا حیدر کے علاوہ تمام اسٹاف نے شرکت کی۔ پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی ہمارے ان ادیبوں و دانشوروں میں سے تھے جنھوں نے پوری زندگی اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کی۔ وہ ایک ماہر غالبیات تھے اور عروض پر ان کا جو کام تھا اسے پوری علمی و ادبی دنیا میں عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے انتقال سے پورے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ ایسا شخص اپنے کاموں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے لہٰذا جب تک دانشوری کی روایت زندہ ہے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ شاہد ماہلی صاحب نے فرمایا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ سے ان کا والہانہ لگاؤ تھا وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے فیلو اور کئی کمیٹیوں کے ممبر بھی تھے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس ادارے نے ان کی اہم کتاب "غالب کی شناخت" شائع کی جس کی علمی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ وہ ادارے کے سیمیناروں میں برابر شریک ہوتے تھے اور ادارے نے اپنے اعزاز 'غالب انعام' سے انھیں سرفراز کیا تھا۔ ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ وہ ایک بڑے ادیب اور دانشور کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے اور اپنے چھوٹوں سے بڑے شفقت سے پیش آتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ایسے ہی انسانوں کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔

اک دیا اور بجھا

مشہور و ممتاز مترجم، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار جناب مظہر الحق علوی کا ۹۱ برس کی عمر میں ۱۷ دسمبر ۲۰۱۳ کی رات تقریباً دس بجے انتقال ہو گیا۔ مرحوم گزشتہ دو مہینے سے صاحب فراش تھے۔ انھیں دل کا عارضہ تھا اور ان دنوں وہ احمد آباد کے مضافاتی علاقہ نشاط باغ کے اپنے مکان میں نہ رہتے ہوئے اپنے برادر عزیز اور صحافی اردو کے معروف ناقد وارث علوی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ مرحوم کے صاحبزادے اقبال علوی، وارث علوی صاحب کے داماد ہیں۔ ۱۷ دسمبر بروز منگل ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو انھیں ایک مقامی اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں شب میں انھوں نے دم توڑ دیا۔ صبح ان کی تدفین شاہی باغ کے قریب ان کے آبائی قبرستان میں انجام پائی۔ یہ قبرستان ولی دکنی کے حوالے سے مشہور ہے۔ مرحوم کا تعلق بھی اسی خانوادے سے تھا۔ گزشتہ سال اردو اکادمی دہلی نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سے نوازا تھا۔ یہ ایوارڈ مرحوم کی انگریزی اور گجراتی زبانوں سے اردو میں ان کے تراجم اور ادبی خدمات کا اعتراف تھا۔ مرحوم نے اپنی حیات میں انگریزی ادب کے سو سے زائد ناولوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا تھا۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے اور بہترین ڈرامہ نگار بھی۔ اپنی ابتدائی زندگی میں انھوں نے 'ترقی پسند تحریک' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے سینے میں تحریک کے حوالے سے ان گنت یادیں سموئے ہوئے تھے جو اگر ضبط تحریر میں آجاتیں تو شاہکار کتابوں کی شکل میں ڈھل جاتیں۔ مرحوم کی موت سے ترجموں کے حوالے سے اردو ادب کا ایک باب بند ہو گیا ہے۔ اب شاید ہی ایسا کوئی مترجم پیدا ہو۔ مرحوم نے ادب اطفال میں بھی کافی کام کیا تھا اور لکھنؤ سے نسیم انہونوی کی ادارت میں شائع ہونے والے بچوں کے رسالے 'کلیاں' کے لیے بہت ساری کہانیاں تحریر کی تھیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

نئی دہلی۔ اردو کے مشہور و ممتاز ادیب اور شاعر جناب محمد متین طارق باغپتی کا طویل علالت کے بعد ۱۴ دسمبر ۲۰۱۳ کو باغپت میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۹۶ برس کے تھے۔ مرحوم کی پیدائش ۱۹۱۷ء میں کاندھلہ میں ہوئی۔ والد سرکاری ملازم تھے، اس لیے ملازمت کے سلسلے میں باغپت میں آکر سکونت اختیار کر لی تھی۔ مرحوم خود بھی تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گئے تھے یہاں تک کہ ریٹائرمنٹ کے بعد گھر پر بھی درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ پوری زندگی علمی و ادبی خدمات کو اپنا شیوہ بنایا۔ تقریباً ساٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے 25 کتابیں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے شائع ہوئی ہیں۔ ان میں کچھ کتابوں کے ہندی ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ (جو خود بھی تدریس کے پیشے سے وابستہ رہی ہیں) دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کی تدفین قصبہ باغپت کے تکیے والی مسجد کے آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔ نماز جنازہ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے پڑھائی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

اردو کے مشہور و ممتاز شاعر حیدر نایاب کا ۱۹ دسمبر ۲۰۱۳ کو بھونیشور (اڑیسہ) میں ۸۳ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ یہ اطلاع ہمیں جناب نور الہی عاشق نے دی ہے۔ بہ حیثیت چیف انجینئر سبکدوشی کے بعد حیدر نایاب نے خود کو مکمل طور پر شعر و ادب کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان کے دو شعری مجموعے 'لمحوں کی بازگشت' اور 'دائرہ در دائرہ' شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں ان کے مقالے 'پروگریو فلاسفی' پر امریکہ سے انھیں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ مشہور شاعر حضرت الاکرام کے حلقۂ تلامذہ میں انھیں خاص مقام حاصل تھا۔ ان کی شعری و نثری تخلیقات ہند و پاک کے موقر رسائل اور خصوصاً 'شاخسار' کٹک میں اکثر شائع ہوتی رہتی تھیں۔ حیدر نایاب صاحب کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے انھیں ایوارڈ سے نوازا تھا۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : مشاہیر کے خطوط نارنگ ساقی کے نام
مرتب : ڈاکٹر سیفی سرونجی
ضخامت : ۲۸۱ صفحات
قیمت : ۲۵۰ روپے
ناشر : انتساب پبلی کیشنز، سیفی لائبریری، سرونج (ایم پی)
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

کے ایل نارنگ ساقی برصغیر ہندو پاک کے مقبول ترین محب اردو ہیں جن کو دوست بنانے کے لیے فیس بک جیسے کسی سوشل نیٹ ورک کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ دامے درمے قدمے سخنے اردو کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ ان کی دو کتابیں بہ عنوان 'ادیبوں کے لطیفے' اور 'خوش کلامیاں قلم کاروں کی' منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس کے علاوہ نارنگ ساقی نے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے بارے میں چار کتابیں بہ عنوان 'کلیات سحر'، 'یادوں کا جشن'، 'ہمارے کنور صاحب' اور 'کنور مہندر سنگھ بیدی سحر' ترتیب و تدوین دی ہیں۔ حال ہی میں 'اسباق' کے مدیر نذیر فتح پوری نے کے ایل نارنگ ساقی کی حیات و کارناموں پر ایک ضخیم کتاب 'محبّانِ اردو کا بے مثال نارنگ ساقی' شائع کی ہے۔ شان بھارتی اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں: "کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا مضمون 'کرشن لال نارنگ ساقی' ایک بہت ہی عمدہ اجمالی جائزہ ہے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ "ساقی صاحب کسی زمانے میں ایک ادبی جریدے سے وابستہ تھے، جس کا نام ساقی تھا۔ جریدہ تو کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا لیکن نارنگ صاحب کے نام کے ساتھ ساقی چسپاں ہو گیا اور اب ان کے دوست انھیں ساقی کہہ کر ہی پکارتے ہیں"۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر ریزہ بکل کے خط کا اقتباس بھی ملاحظہ فرمایئے: "جناب کنور مہندر سنگھ بیدی کا یہ جملہ بہت پسند آیا کہ "نارنگ ساقی نام ہی کے نہیں کام کے بھی ساقی ہیں"۔ بہ قول مشفق خواجہ "وہ سورج غروب ہونے کے بعد ہی شاعروں سے ملتے ہیں"۔ دوستی کا اتنا بڑا دائرہ اور ایسی رشک کرنے والی ہردلعزیز شخصیت نہ صرف ان کی مہمان نوازی اور ادب نوازی کی جانب اشارہ کرتی ہے بلکہ وہ اپنے دوستوں سے رابطہ رکھنے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ان کے پاس بے شمار خطوط آتے ہیں اور وہ کسی پس و پیش کے بغیر ان کا جواب دیتے ہیں، وہ خطوط چاہے نامور ادیبوں کے ہوں یا پھر گمنام ادیبوں کے۔ بہ قول سیفی سرونجی "ان میں بعض خط ایسے بھی ہیں، جن میں ہم اپنے عہد کی ادبی فضا، ادبی ماحول، ادبی سرگرمیوں سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔۔۔ ان خطوں میں ہم ذہنی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں اور ادب کے بدلتے منظر نامے کی جھلکیاں بھی دیکھ سکتے ہیں اور نارنگ صاحب کی شخصیت کے علمی و ادبی تمام کارناموں کے علاوہ ان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے بھی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔"

سیفی سرونجی نے ہزاروں خطوط میں سے ۱۵۲ مشاہیر کے خطوط چن کر زیر نظر کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ ان میں ایک جانب پاکستان کے مشہور ادیب قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی، اظہر جاوید اور مشفق خواجہ وغیرہ ہیں جب کہ دوسری جانب آل احمد سرور، بشیر بدر، جگن ناتھ آزاد، جوگیندر پال، رام لعل، شمس الرحمن فاروقی، کیفی اعظمی، گیان چند جین، مجروح سلطان پوری اور وارث علوی جیسے ہندوستان کے نامور ادیب بھی ہیں۔ اتنا ہی نہیں اردو کی نئی مغربی بستیوں کے ادبا جیسے ہر چرن چاؤلہ، جوگیندر بل، تسنیم حیدر قریشی اور مقصود الٰہی شیخ بھی شامل اشاعت ہیں۔ علاوہ ازیں اردو نواز دو سیاست دانوں، آئی کے گجرال، سابق وزیر اعظم ہند اور اے آر قدوائی، سابق گورنر ہریانہ کے خطوط بھی شامل ہیں۔ مشمولہ خطوط میں زیادہ تر خطوط وہ ہیں جن میں نارنگ کی کتابوں پر مشاہیر نے اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ البتہ قتیل شفائی اور اظہر جاوید، مدیر 'تخلیق' لاہور سے ان کے قریبی مراسم تھے اس لیے ان کے خطوط میں ذاتی زندگی کے چند گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مشمولہ خطوط سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

☆ "اس کتاب (ادیبوں کے لطیفے) میں شامل سبھی لطیفے پڑھ کر اور تصاویر کا بے پناہ اضافہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ آپ کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اور آپ کی ادبی دنیا کتنی وسیع ہے۔" (رام لعل)

☆ "یہ کام (خوش کلامیاں قلم کاروں کی) وہی شخص کر سکتا ہے جسے نہ صرف شعر و ادب اور زبان اور اس کی تہذیب سے عشق ہو بلکہ ایک دلدار اور دلفریب شخصیت کا مالک بھی ہو۔ جو عظیم فنکاروں کے فن اور ان کی شخصیت کی سحر انگیزی کو ایک حیرت زدہ بچے کی معصومیت سے دیکھتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔" (وارث علوی)

اردو ادب کی نثر و نما میں مکتوبات کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دلکش اردو نثر کی بنیاد غالب کے مکاتیب کی مرہونِ منت ہے، اس لیے ادیبوں کے خطوط کا ہر نیا مجموعہ ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے کیوں کہ اس کے توسل سے نہ صرف شاعروں، نثر نگاروں، محققوں اور نقادوں کے ذہن تک رسائی ہوتی ہے بلکہ اس وقت کا رجحان بھی سامنے آتا ہے جب وہ خط لکھے گئے تھے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو زیر نظر کتاب بھی ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی پذیرائی ہوگی۔

☆☆☆

نام کتاب : محبوب و نذیر فنکار بے نظیر
مصنف : ڈاکٹر عظیم راہی
ضخامت : ۱۷۶ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتا : ڈاکٹر عظیم راہی، کریم کالونی روشن گیٹ، مدینہ مسجد اورنگ آباد، مہاراشٹر
تبصرہ نگار : مفتی حبیب الرحمن ندوی
E-mail: muftihabib0786@gmail.com

عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کا تعلق اردو کے دو نامور قلم کاروں ڈاکٹر محبوب راہی اور ڈاکٹر نذیر فتح پوری سے ہے۔ حسنِ اتفاق دیکھیے کہ حال ہی میں ادب کے ان دونوں قلم کاروں کی ممتاز ادیب اور نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مختلف ادبی جہتوں پر مشتمل تحریروں کا مجموعہ 'گوپی چند نارنگ ایک ہمہ گیر شخصیت' عنوان کے تحت منظر عام پر آیا ہے۔ اب ان دونوں تخلیق کاروں کے تعلق سے ڈاکٹر عظیم راہی نے اپنے مختلف مضامین یکجا کر کے ایک کتاب کی شکل میں پیش کرتے ہوئے گویا ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں:

پہلا حصہ 'محبوب' جس کے تحت ڈاکٹر محبوب راہی کی مختلف اصنافِ نظم و نثر پر مبنی پندرہ کتابوں پر لکھے گئے عظیم راہی کے تجزیاتی مضامین شامل ہیں۔ اسی طرح دوسرے حصہ 'نذیر' کے تحت نذیر فتح پوری کی ۱۱ تصانیف کی روشنی میں ان کی فکری و فنی شخصیت کا تجزیہ کیا گیا۔

عرضِ مصنف کے تحت عظیم راہی نے محبوب راہی کے اپنے استاد ہونے کی حیثیت سے اور نذیر فتح پوری کے ایک محترم اور دیرینہ دوست ہونے کی حیثیت سے ان دونوں کے تئیں اپنے جذباتی تعلق کے اظہار کو اس کتاب کی وجہ جواز قرار دیا ہے۔ معروف شاعر و نقاد ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے پیش لفظ کے حوالے سے صاحب کتاب اور موضوعات کتاب دونوں پر تنقیدی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لاشعور کے کرشمے اور تحلیل نفسی کے تجربات سے تعبیر کیا ہے۔

عصر حاضر کے دو معروف قلم کاروں کے تخلیقی نظریات کو سمجھنے اور ان کے فکری و فنی جہتوں کے تعین کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ◎◎

ہمارے لیے

منٹو صاحب

شمس الرحمٰن فاروقی

'ہمارے لیے منٹو صاحب' عہد ساز محقق، نقاد اور صف اول کے تخلیق کار پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ اس کتاب میں فاروقی صاحب نے اشعر نجمی صاحب کے نام ایک خط کی شکل میں 'گفتار اول تا گفتار چہارد ہم' کے ذیلی عنوان قائم کر کے عظیم افسانہ و ناول نگار سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہوئے ان پر جامع اور مدلل بحث کی ہے۔

بلاشبہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی یہ کتاب سعادت حسن منٹو کی مختلف الجہات شخصیت کی افہام و تفہیم کے لیے یقیناً بہت معاون اور مددگار ثابت ہوگی۔ اس کتاب کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ سعادت حسن منٹو کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

ضخامت: ۱۳۰ صفحات —— قیمت: ۱۰۰ روپے

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، 10 میٹرو پول مارکیٹ 2/2724، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی-2

بقیہ: خواجہ حسن نظامی

صفحہ ۸ سے آگے

کیا تھا کہ ایک دیوہیکل شخص نہایت خونخوار انداز میں کھڑا ہے اور اس کے سامنے ایک نحیف سا مچھر بیٹھا ہے۔ مچھر کہہ رہا ہے "تو نمرود ہے اور میں مچھر۔ میں تیری ناک میں گھس جاؤں گا"۔ بارے کچھ لوگ بیچ میں پڑے اور لڑائی بند کرائی گئی۔ خواجہ صاحب نے اس ساری لڑائی کی روداد 'جنگ صفین' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کی۔ یہ کتاب خوب بکی۔

خواجہ صاحب کو قوالی سے بڑی دلچسپی تھی۔ ایک دفعہ دلی کے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سارے اڈیٹروں کو آموں اور آئس کریم کی دعوت دی۔ بڑا عمدہ انتظام کیا۔ اطلاع دے دی کہ سروں آم کھائے اور بڑی خوش ذائقہ آئس کریم۔ انگریزوں کو قوالی سنوانا تو ان کے لیے ایک عام بات تھی۔ سترہویں کے موقعے پر عرس سے ایک دن پہلے خواجہ صاحب میدان عرفات میں اپنے انتظام سے قوالی کراتے تھے۔ انھوں نے اپنے احاطوں اور کمروں اور زمینوں کے عجیب عجیب نام رکھے تھے۔ انہی میں سے ایک احاطے کا نام میدان عرفات تھا۔ ایک وادی ایمن تھی۔ ایک ایمان خانہ تھا۔ خود جس گھر میں رہتے تھے اس کا نام ریگ بسیرا تھا۔ قوالی میں شہر اور باہر کے تمام مشہور آدمی مدعو ہوتے تھے۔ ہندو اور سکھ بھی بڑی عقیدت سے اس محفل میں شریک ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب تقریر کرتے اور سلطان جی یا امیر خسرو کے واقعات بتاتے۔ ہندوستان کی چیدہ چیدہ ٹولیاں قوالی سناتیں۔ ایک زمانے میں ننھو قوال کا دور دورہ تھا۔ جب اس پر کسی وجہ سے عتاب ہو گیا تو واحد قوال نے اپنا رنگ جمایا۔ واحد قوال صاحب خود پیری مریدی کرتے تھے۔ وہ بھی کچھ عرصہ بعد معتوب ہو گئے۔ ان کے بعد پریم راگی مشہور ہوئے اور وہ لد گئے تو ایک چھوٹا قوال تھا، اسے نظام راگی کا خطاب دے کر مشہور کیا گیا۔ غرض خواجہ صاحب کے خاص قوال یوں ہی بنتے بگڑتے رہے۔

میرے لڑکپن میں خواجہ صاحب نے دلی سے ایک نیا اخبار 'رعیت' جاری کیا تھا۔ اس میں کام کرنے سردار دیوان سنگھ دلی آئے تھے۔ سردار دیوان سنگھ پہلے کہیں کمپاؤنڈر تھے مگر انھیں ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ مجھے تو بڑا آدمی بننا ہے۔ اخبار نویسی کا شوق رکھتے تھے۔ اخبار 'رعیت' کی اڈیٹری سے ان کی اخباری زندگی شروع ہوئی۔ خواجہ صاحب نے ان کے خلوص و محبت کو دیکھ کر 'مفتون' کا خطاب دیا۔ پھر دیوان سنگھ صاحب نے اپنا اخبار 'ریاست' شائع کرنا شروع کر دیا۔

مفتون سے خواجہ صاحب کے تعلقات سالہا سال تک اچھے رہے۔ کبھی کبھی ان میں کھٹک بھی گئی مگر صلح صفائی ہو گئی۔ پھر ایک معاملے میں ایسی بگڑی کہ ہزار کوششوں پر بھی سردار صاحب کا دل صاف نہ ہوا اور آخر تک یہ چشمک جاری رہی۔ خواجہ صاحب نے بھی مفتون کے خلاف بہت کچھ لکھا مگر آخر میں خود ہی خاموش ہونا پڑا، کیوں کہ مقابلہ بڑے بے ڈھب آدمی سے تھا۔ خواجہ صاحب نے ایک بات یہ بڑے مزے کی لکھی تھی کہ میں نے سردار دیوان سنگھ کو 'مفتون' کا خطاب دیا تھا جس کے معنی ہیں فتنہ زدہ۔

خواجہ صاحب کی مطبوعات کئی سو ہیں۔ یہ کتابیں تین طرح کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو خواجہ صاحب نے خود لکھی ہیں۔ دوسری وہ ہیں جو خواجہ صاحب نے لکھوائی ہیں یا ترجمہ کرائی ہیں اور مصنف یا مترجم ہی کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ تیسری وہ جو خواجہ صاحب نے اپنی نگرانی میں اور اپنے ہی طرز تحریر میں لکھوائی ہیں۔ موخر الذکر کتابوں پر اصل مصنف کا نام نہیں دیا گیا۔ خواجہ صاحب ہی کے نام سے یہ کتابیں منسوب ہیں۔ بعض لوگ اس بات کو خواجہ صاحب کی بددیانتی پر محمول کرتے ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے ان کتابوں میں اتنی اصلاح و ترمیم کی ہے کہ یہ کتابیں حقیقت میں انہی کی ہو گئی ہیں۔ واقعات تو وہی ہیں جو سیکڑوں کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ انھیں ایک خاص انداز میں سلیقے سے پیش کرنا ہی اصل کمال ہے۔ ظاہر ہے خواجہ صاحب ہندی کے پنڈت نہیں تھے لیکن خواجہ صاحب کا ترجمہ قرآن ہندی میں موجود ہے۔ خواجہ صاحب نے یہ ہندی خود تو لکھی نہیں ہو گی، کسی اچھے ہندی جاننے والے سے لکھوائی ہو گی، مگر اس کا ایک ایک لفظ خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لیا ہو گا۔ فقرے بھی بدلوائے ہوں گے۔ ترجمے کی صحت کا بھی خیال رکھا ہو گا۔ ترجمے کی ذمہ داری بھی خواجہ صاحب ہی کے سر ہے اس لیے یہ ترجمہ خواجہ صاحب ہی کا ہوا۔

دلی میں ایک جید عالم مولوی عبد السلام صاحب تھے۔ انھیں دنیا بھر کے علوم پر عبور حاصل تھا۔ جس علم سے کہیے خدا کا وجود ثابت کر دیتے تھے۔ ان کے علم کی دھاک دور دور تک بیٹھی ہوئی تھی اور واقعہ بھی یہ ہے کہ وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مزاج قلندرانہ ہے۔ اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتے۔ اور جب انھیں جلال چڑھتا ہے تو علوم کے سمندر میں طوفان آ جاتا ہے۔ پھر مولانا کی جادو بیانی سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ منطق چھانٹنے پر آتے ہیں تو وہ ناک جوڑی کا بخیہ کرتے ہیں کہ پیوند پر پیوند لگتا چلا جاتا ہے اور ہزار جامہ تیار ہو جاتا ہے۔ تصوف کے بھی دلدادہ ہیں۔ عرسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ قوالی سنتے ہیں۔ رنڈیوں کا گانا بھی سنتے ہیں۔ حسن پرست ہیں۔ ہر چیز میں یار کا جمال دیکھتے ہیں۔ کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں کرتے۔ اور کس کی شامت نے دھکا دیا ہے کہ ان سے بھڑے۔ انھیں چھیڑنا تو ایسا ہے جیسے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دینا۔ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ مگر ان کی تقریر کا لطف اٹھانا ہو تو ایک ذرا انھیں چھیڑنا ہی پڑتا ہے۔ بس پھر آپ چپکے رہیے اور ان کی گل افشانی گھنٹوں سنتے جائیے۔ تو ان مولانا عبد السلام سے خواجہ صاحب کی بھی یاد اللہ تھی۔ خواجہ صاحب نے ان سے فرمائش کی کہ آپ ایک کتاب تصوف پر لکھ دیجیے۔ مولانا نے فرمایا "خدا خوش رکھے، لکھ دیں گے شیخ"۔ مولانا کو لکھنے کا شوق نہیں ہے پھر بھی انھوں نے اپنے خلاف مزاج ایک پوری کتاب تصوف پر لکھ دی۔ کتاب پوری ہوئی تو کسی جمعرات کو سلطان جی پہنچے اور فاتحہ پڑھ کر خواجہ صاحب کے ہاں گئے۔ خواجہ صاحب تو انھیں خوب اچھی طرح سے جانتے ہی تھے۔ بڑے سلیقے سے کتاب کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ مولانا کی تعریف کی۔ کتاب کی تعریف کی۔ معاوضہ بھی ان سے طے کر لیا۔ آخر میں بولے کتاب آپ کے نام سے شائع نہیں ہو گی۔ مولانا نے کہا "کیا مضائقہ ہے شیخ"۔ خواجہ صاحب بولے "میرے نام سے شائع ہو گی"۔ مولانا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ خواجہ صاحب کا کچھ لحاظ ہی کر گئے۔ خواجہ صاحب کے ہاتھ سے کتاب لے کر اس کے چار ٹکڑے کیے اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دی۔ خواجہ صاحب نے کہا "یہ آپ نے کیا کیا؟" بولے "خدا خوش رکھے، چائے پلاؤ شیخ" اور پی کر چلے آئے، گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ آخر تک خواجہ صاحب سے اسی وضع داری سے ملتے رہے۔ وہ کتاب چھپ جاتی تو علمی نوادر میں شامل ہوتی۔

خواجہ صاحب کا اثر مسلمان والیان ریاست پر بہت تھا۔ نظام دکن انھیں دو تین سو روپے ماہوار وظیفہ دیتے تھے۔ حیدرآباد کے تمام امرا انھیں بہت مانتے تھے۔ مہاراجہ کرشن پرشاد تو ان کے مرید ہی تھے اور ایسے مرید کہ اپنے بڑے لڑکے کا نام انھوں نے خواجہ پرشاد رکھا تھا۔ خواجہ صاحب کی اس کامیابی نے ان کے بہت سے حاسد پیدا کر دیے تھے۔ انھیں طرح طرح سے بدنام کرنے کی کوششیں کی جاتی تھیں۔ خواجہ صاحب کو راسپوٹین تک بنایا گیا، مگر خواجہ صاحب کی کرامات دیکھیے کہ ان کے اقتدار میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ رامپور، مانگرول، ماناودر، جاورہ، سارے نواب انھیں سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ افتخار علی خاں نواب جاورہ خواجہ صاحب کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ ننھو قوال جاورہ دربار کا خاص قوال تھا، وہ گاتا بھی اچھا تھا اور کچھ اس ادا سے بتاتا بھی تھا کہ دیکھنے والے پھڑک جاتے تھے۔ اس کی اسی ادا سنجی پر نواب جاورہ بھی لوٹ تھے۔ نواب جاورہ اور خواجہ صاحب بیٹھے تھے اور ننھو گا رہا تھا۔ اس نے ایک شعر گایا اور نواب نے ایک توڑا روپیوں کا دے دیا۔ دوسرا شعر گایا اور دوسرا توڑا دے دیا۔ اس طرح کئی توڑے دے دیے تو خواجہ صاحب اٹھے اور ننھو کو خاموشی کا اشارہ کر کے نواب سے بولے "یہ ننھو ہے تو آپ بھی دل شاہ ہیں"۔ نواب صاحب نے خواجہ صاحب کو سینے سے لگا لیا۔ اس دن سے نواب کا نام ہی دل شاہ مشہور ہو گیا۔ یہاں تک کہ ان کی رعایا بھی انھیں دل شاہ ہی کہنے لگی۔

خواجہ صاحب بڑے زندہ دل اور شگفتہ مزاج آدمی تھے۔ حاضر جواب بھی ایسے ہی تھے۔ گھر پر ان کے قریب ٹیلیفون رکھا رہتا تھا۔ دن بھر میں سیکڑوں ٹیلی فون آتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ گھنٹی بجی۔ خواجہ صاحب نے ٹیلی فون اٹھایا اور بغیر جواب دیے بند کر دیا۔ پھر خود ہی کہتے کوئی گالیاں دے رہا تھا۔ ایک صاحب نے ٹیلی فون پر پوچھا "خواجہ صاحب آپ روزنامچہ تو لکھتے ہیں شب نامچہ کیوں نہیں لکھتے"۔ گھنٹی سن کر خواجہ صاحب نے ٹیلی فون اٹھایا۔ کوئی صاحب بلی کی بولی بولے "میاؤں"۔ خواجہ صاحب نے بلے کی طرح "ایں... آؤں" کہا اور اس نے گھبرا کر ٹیلی فون بند کر دیا۔

خواجہ صاحب ذرا سی بات میں ناراض ہو جاتے تھے اور ذرا سی بات میں خوش بھی ہو جاتے تھے۔ قائد اعظم سے اختلاف ہوا تو عرصہ دراز تک ان کے خلاف لکھتے رہے۔ پھر ان کے ہم خیال ہوئے تو اس شدت کے ساتھ کہ قرآن کی رو سے مولانا آزاد کے قتل کا فتویٰ تک دے دیا۔ اس کے بعد پھر مولانا آزاد کے بھی دوست ہو گئے۔ علامہ اقبال سے خواجہ صاحب کے ذاتی تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ نہ جانے خواجہ صاحب کو کس بات سے رنجش ہو گئی کہ اقبال کو شاعر مشرق سے گھٹا کر انھوں نے شاعر پنجاب لکھنا شروع کر دیا۔ علامہ اقبال نے سوچا کہ یہ تو بہت برا ہوا۔ چناں چہ انھوں نے خواجہ صاحب کو زک دینے کی ایک ترکیب سوچی۔ خواجہ صاحب کو ایک خط لکھا کہ میرے گھٹنے میں مدت سے درد تھا۔ میں نے آپ کا فاسفورس کا تیل ملا۔ اس سے درد کو افاقہ ہو گیا۔ اس دن سے علامہ اقبال پھر شاعر مشرق ہو گئے۔ 'منادی' میں فاسفورس کے تیل کا جو اشتہار چھپتا تھا اس میں شاعر مشرق سر محمد اقبال کی رائے ضرور شائع ہوتی تھی۔

اگست ۱۹۴۷ میں جب دلی میں فساد کا سلسلہ شروع ہوا تو خواجہ صاحب بستی نظام الدین ہی میں تھے۔ وہ بار بار دلی کے افسروں کے پاس جاتے مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ آخر تنگ آ کر پٹیل کے پاس پہنچے۔ اس نے پہلے تو انتظار کرایا اور پھر ملا تو بڑی بے رخی سے ملا۔ پٹیل کی لڑکی خواجہ صاحب کی بڑی عزت کرتی تھی، وہ بھی وہاں آ گئی تو پٹیل کچھ پسیجا، خاطر خواہ نتیجہ تو پھر بھی نہ نکلا۔ اتنا ضرور ہوا کہ بستی نظام الدین کی حفاظت کا کچھ انتظام ہو گیا مگر خواجہ صاحب دل برداشتہ ہو کر اپنے گھر والوں کو لے کر ہوائی جہاز سے حیدرآباد دکن چلے گئے۔ یہاں ان کے گھر بار پر تالے پڑ گئے اور پہرے بیٹھ گئے۔ جب پوری طرح امن امان ہو گیا تو خواجہ صاحب دلی واپس آئے۔ حکومت سے اپنا گھر واگزاشت کرایا۔ خدا جانے کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔ کاروبار ان کے سب بگڑ گئے۔

اسلامی ریاستیں سب ختم ہو گئیں۔ دوست کم اور دشمن زیادہ ہو گئے۔ واحدی صاحب تک کراچی چلے آئے لیکن خواجہ صاحب بڑی ہمت کے آدمی تھے، ہر قسم کی مصیبت جھیلتے رہے مگر بائیس خواجہ کی چوکھٹ اور سلطان جی کا آستانہ نہیں چھوڑا۔ اکبر الہ آبادی بہت پہلے کہہ گئے تھے:

حضرت ابو ہریرہ سے بلی نہ چھٹ سکی
خواجہ حسن نظامی سے دلی نہ چھٹ سکی

آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ صحت نے جواب دے دیا تھا۔ پریشانیوں کا ہجوم تھا مگر پہلو میں دل اسی طرح زندہ تھا۔ دل میں اسی طرح امنگ اور ترنگ تھی۔ بڑھاپے نے کمر توڑ دیا تھا مگر خوش گفتاری میں فرق نہ آیا تھا۔ آخری وقت تک چہکتے رہے یہاں تک کہ طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔

●●●

یادِ رفتگاں

دوسری اور آخری قسط

خواجہ حسن نظامی

جب طنز کی سنے بہت زور پکڑا تو خواجہ صاحب نے تبلیغ کا کام شروع کردیا۔ اس میں اتنے کامیاب رہے کہ ایک چھوٹے موٹے راجہ کو بھی انھوں نے مسلمان کرلیا تھا۔ مگر سوامی شردھانند کی تحریک بڑھتی ہی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ پوری ہندو قوم کی دولت تھی۔ خواجہ صاحب نے تاڑ لیا کہ یہ یوں نہیں دبے گا، لہٰذا انھوں نے سوامی جی کو مباہلے کا چیلنج دے دیا۔ خواجہ صاحب نے کہا "آؤ ہم تم دونوں قطب مینار پر سے چھلانگ لگاتے ہیں۔ جو سچا ہوگا وہ بچ جائے گا۔ اور جو جھوٹا ہوگا وہ مر جائے گا"۔ خواجہ صاحب نے تمام اخباروں میں اس کا اعلان کروادیا اور اس کا وقت بھی مقرر کردیا۔ اس دن صبح ہی سے قطب مینار پر خلقت کے ٹھٹ لگنے شروع ہوگئے۔ خلق خدا امڈی چلی آتی تھی۔ وقت مقررہ پر خواجہ صاحب آپہنچے مگر شردھانند نہیں آئے۔ خوب تھڑی تھڑی ہوئی اور میدان خواجہ صاحب کے ہاتھ رہا (ایک روایت یہ بھی ہے کہ شردھانند پہنچ گئے، خواجہ صاحب نہیں پہنچے)۔

دلی میں جتنے بھی مسلمان اڈیٹر اور اشتہاری حکیم تھے سب کے سب بالواسطہ یا بلاواسطہ خواجہ صاحب کے مرہون منت تھے۔ خواجہ صاحب نے کتابوں اور رسالوں کے علاوہ دوائیں اور غذائیں بھی بیچنی شروع کردی تھیں۔ "فقیر کی چٹنی" اور "چودہ بھوارے" اور عجیب عجیب ناموں کی دوائیں تھیں۔ دوائیں ان کی کتابوں سے بھی زیادہ بکتی تھیں۔ سویابین اور قاضیوں کا تیل تو پاکستان بننے سے پہلے تک مشہور ہوتا رہا۔ تجارت کا اصول یہ سمجھا جاتا تھا کہ کتابوں میں چار آنے کا ایک روپیہ بنتا ہے اور دواؤں میں ایک آنے کا ایک روپیہ۔ اکثر باہر والے کسب معاش کے لیے دلی آتے اور خواجہ صاحب کے ہاں ملازم ہوگئے۔ تھوڑے دنوں میں انھوں نے خواجہ صاحب کا سارا کاروبار سیکھ لیا۔ خریداروں کے پتے ان کے ہاں سے چرالیے اور نوکری چھوڑ خود اپنا کاروبار لے بیٹھے۔ اور برکت بھی اللہ نے ان کے اس چوری کے کاروبار میں ایسی دی کہ ان میں سے کئی تو اب کھرب پتی ہیں۔ خواجہ صاحب کے رسالے بھی ٹھپ ہوگئے اور دوائیں بھی، مگر ان کے رسالے بھی خوب چل رہے ہیں اور دوائیں بھی۔ ان میں سے ایک صاحب شاکی تھے کہ کراچی میں بہت مہنگائی ہے، فرماتے تھے کہ جو چٹنی پہلے ایک آنے میں گھر پڑتی تھی، اب دو آنے میں تیار ہوتی ہے۔ جتنی پہلے بھی تین روپے کی تھی اور اب بھی تین ہی روپے کی بکتی پڑتی ہے۔

ایک زمانے میں خواجہ صاحب کی قوت ارادی غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں وہ قوت تھی جو مسمریزم کرنے والوں میں ہوتی ہے۔ جہاں انھوں نے کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور وہ موم ہوا۔ ایک دفعہ خواجہ صاحب دوپہر کو اپنے دفتر میں اکیلے بیٹھے تھے کہ ایک لٹھ بند آریہ سماجی اندر گھس آیا۔ خواجہ صاحب نے لکھتے لکھتے قلم روکا، آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولے "چلے جاؤ یہاں سے"۔ اور وہ کچھ ایسا مرعوب ہوا کہ فوراً واپس چلا گیا۔ ایک دفعہ اور ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ پرانی قلمی کتابوں کا ایک ذخیرہ دکھانے کے بہانے سے ایک غنڈہ خواجہ صاحب کو ایک گھر میں لے گیا۔ جب خواجہ صاحب گھر میں داخل ہوگئے تو اُس نے کواڑ بند کرکے کنڈی لگالی۔ خواجہ صاحب بالکل ہراساں نہیں ہوئے۔ ڈپٹ کر بولے "کھول دروازہ"۔ اس نے سہم کر دروازہ کھول دیا اور خواجہ صاحب بڑے اطمینان سے اپنے گھر چلے آئے۔

پروپیگنڈہ خواجہ صاحب کی سب سے بڑی قوت بھی تھی اور کمزوری بھی، خوبی بھی اور عیب بھی۔ اپنی بات منوانے کے لیے وہ جائز و ناجائز، موزوں اور ناموزوں کا امتیاز اٹھا دیتے تھے۔ مثلاً سلطان جی کی باؤلی پر سے جو گھیارا بائیں ہاتھ سے اندر جاتا ہے اس کے سرے پر ایک قبر سب سے نمایاں ہے۔ اس پر کتبہ لگوا دیا "حسن نظامی کے دادا کی قبر۔ واللہ اعلم بالصواب"۔

اردو کا پروپیگنڈہ کرنے پر آئے تو اپنے ایک گھر کا نام "اردو منزل" رکھ دیا اور اس میں تمام ٹائل لگوا دیے جن پر "ہر گھر اردو اور گھر گھر اردو" لکھا ہوا تھا۔ یہ ٹائل انھوں نے خود بنوائے تھے اور تلقین فرمائی تھی کہ تمام مسلمانوں کو یہ ٹائل خرید کر گھروں میں لگوانے چاہئیں۔

خواجہ صاحب کے دماغ میں نئی سے نئی آتی تھی۔ ایک زمانے میں اعلان چھاپنے پر کتابیں چھاپنے کا اعلان کیا۔ اس کے لیے ایک کمپنی قائم کی جس کا نام "دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ" رکھا۔ اس کے حصے فروخت کیے گئے، خوب روپیہ برسا، مگر کچھ ہی عرصے بعد یہ کمپنی ایسی غائب ہوئی کہ لوگ دیکھتے ہی رہ گئے۔ اسی طرح غالب کے مزار کے لیے کئی دفعہ اپیل کرکے چندہ جمع کیا مگر مزار نہ بن سکا۔ لیکن ان کے عقیدت مندوں کی عقیدت مندی میں کوئی فرق نہ آیا۔

خواجہ صاحب کو غصہ کبھی نہ آتا تھا۔ نہایت شائستہ اور میٹھی گفتگو کرتے تھے۔ ہر ایک کی سفارش کے لیے جھٹ تیار ہوجاتے اور دامے، درمے، قدمے، سخنے اس کی مدد کرتے۔ غرور ان میں نام کو نہیں تھا۔ ہر ایک سے اچھی طرح پیش آتے یہاں تک کہ بدخواہوں اور دشمنوں سے بھی۔

خواجہ صاحب سلجھی ہوئی طبیعت کے آدمی تھے۔ مذہبی پیشواؤں میں بھی شمار ہوتے تھے، مگر تنگ نظر ملائیت سے کوسوں دور تھے۔ تھیٹر اور سنیما دیکھتے تھے۔ قوالی تو خیر سارے ہی صوفی سنتے ہیں۔ خواجہ صاحب قوالی کے علاوہ بھی اور سب قسم کے گانے سن لیتے تھے۔ کوئی تیس سال اُدھر کا ذکر ہے، کرنل اشرف الحق حیدرآباد دکن سے دلی آئے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب شخصیت کے آدمی تھے۔ چودہ سال ولایت میں رہ کر ڈاکٹری پڑھی تھی۔ ریاست دکن کی افواج کے بڑے ڈاکٹر تھے۔ ہزل اور فحش گوئی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مسکرات کے تجربات کرتے ساری عمر گزر گئی۔ تجربے اپنے اوپر بھی کرتے تھے اور دوسروں پر بھی۔ مزاج درویشانہ تھا، فرقہ رفاعیہ سے منسلک ہوگئے تھے اور خلیفہ بھی ہوگئے تھے۔ ضربیں لگاتے تھے۔ کیمیا بنانے کا بھی شوق تھا مگر سونا کبھی نہیں بنا۔ ہمیشہ ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ کرنل صاحب کے تعلقات خواجہ صاحب سے مخلصانہ تھے۔ اس زمانے میں جب دلی آئے تو اپنے آبائی مکان میں اترے۔ یہ مکان تراہا بیرم خاں منقی والوں کے پھاٹک میں ہے۔ نیم کا بنا ہوا ہے، اس لیے نیم کی حویلی کہلاتا ہے۔ اس نیم کی حویلی کی کھلی چھت پر ایک محفل سماع برپا ہوئی۔ دلی کی دو بہنیں تھیں جو مل کر گاتی تھیں۔ یہ ستارائیں کہلاتی تھیں۔ انھوں نے تو خود بھی نہیں کمایا البتہ ان کے باپ دادا لال بیگی تھے۔ انھوں نے بچپن ہی سے گانا سیکھا تھا۔ شرفا کی محفلوں میں جاتی تھیں۔ ہر جگہ جاتی بھی نہ تھیں۔ صاف ستھرا لباس، اچھے چہرے مہرے، نستعلیق گفتگو، قاعدے قرینے سے واقف۔ ایک بہن ڈھولک لے لیتی، برابر میں استاد جی سارنگی لے کر بیٹھتے، پیچھے ہارمونیم والا ہوتا۔ ایک بڑے بڑے گلچھوں والا آدمی ان کے ساتھ ہوتا۔ یہ ان کا باپ تھا۔ ساز ملے، راگ شروع ہوا... آوازیں، سماں بندھ جاتا تھا۔ اس محفل میں خواجہ صاحب بھی شریک ہوتے تھے۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں مولانا

شاہد احمد دہلوی

محمد علی سے خواجہ صاحب کی خوب چل رہی تھی۔ روزانہ خواجہ صاحب کے پوسٹر نکل رہے تھے۔ مولانا محمد علی نے خواجہ صاحب کا نام ہی "بجھ آدم پوسٹر" رکھ دیا تھا۔ کوئی غزل گا رہی تھی، پورا شعر یاد نہیں رہا۔ مصرعہ ثانی تھا:

تمھاری برکتیں چھپ گئی ہے اشتہاروں میں

اس پر ایک قہقہہ پڑا تو خواجہ صاحب چونکے اور مسکرا کر بولے "کیا ہے؟ کوئی پوسٹر؟" اس پر ایک اور قہقہہ پڑا اور دیر تک سب ہنستے رہے۔

ایک دفعہ خواجہ صاحب اور مولانا محمد علی میں چلی اور ایسی چلی کہ بھلے آدمی تراہ تراہ پکار اٹھے۔ ایک صاحب تھے ضیاء الحق پانڈو کے رہنے والے۔ اپنے وقت کے بڑے مشہور لوگوں میں سے تھے۔ انھیں بڑے بڑوں کو نیچا دکھانے میں مزہ آتا تھا۔ ہر ایک کی ٹوہ لیتے رہتے اور جہاں موقع ملتا چٹکی لیتے۔ ان کے کاٹے کا منتر ہی نہ تھا۔ اپنے اس فن کی وجہ سے ہزاروں کے وارے نیارے کرتے تھے۔ یہ صاحب خواجہ صاحب کے بھی دوست تھے اور مولانا محمد علی کے بھی۔ نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ انھوں نے ان دونوں دوستوں کو لڑوادیا۔ خواجہ صاحب کا کوئی خط تھا جس کی بنیاد پر انھیں انگریزوں کا جاسوس ٹھہرایا گیا۔ مولانا محمد علی انگریز کے نام سے جلتے تھے، ان کے تو تلوؤں سے لگی تو تالو سے نکل گئی۔ ایسے چراغ پا ہوئے کہ اپنے اخبار ہمدرد میں انھوں نے خواجہ صاحب کے خلاف لکھنا شروع کردیا۔ خواجہ صاحب بھلا کب دبنے والے تھے۔ انھوں نے ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کیا اور ایک نیا اخبار ہی اس ہنگامے کے لیے جاری کردیا۔ دونوں طرف سے وہ گندگی اچھلی کہ توبہ ہی بھلی۔ دونوں کا یہ برا اثر پڑا کہ دونوں کی قدر و قیمت لوگوں کے دلوں سے جاتی رہی۔ خواجہ صاحب کے اخبار میں ایک کارٹون چھپا جس میں دکھایا

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۹۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org